اسلامی نظامِ معاشرت کا ایک بہت اہم پہلو

حکیم شریف احسن صاحب

معاشرت مِل جُل کر رہنے کا نام ہے۔ انسان اپنی فطرت سے مجبور ہیں کہ مل جُل کر رہیں۔ اِس لیے بغیر کسی جبر کے وہ مل کر رہتے ہیں۔ رہبانیت سے انسانوں نے بحیثیت مجموعی ہمیشہ گریز کیا ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ کسی قوم یا ملک کے سب کے سب افراد بستیوں کو چھوڑ کر ویرانوں کا رُخ کر لیں۔ اور ہر انسان پہاڑ کے کسی غار یا جنگل کی کسی کھوہ میں اپنی ایک الگ دُنیا بسا لے، جس کی کل آبادی فردِ واحد پر مشتمل ہو۔

اگر یہ صحیح ہے، اور تاریخ کی گواہی یہی ہے کہ یہ صحیح ہے تو اس سے بنیادی سوال یہ سامنے آتا ہے کہ انسان مِل جُل کر کس طرح رہیں؟ کیا معاشرے میں جنگل کا قانون رائج ہو کہ جس کے جی میں جو آئے کر گزرے یا کچھ اُصول و قواعد ہوں جو انہیں ساتھ ساتھ رہنے کا سلیقہ سکھائیں؟ اس سوال کے جواب کے مطابق ہی دُنیا میں مختلف معاشرے وجود میں آئے ہیں اور حقیقتاً کسی بھی نظامِ زندگی کی اصل آزمائش اس کے معاشرتی نظام میں ہوتی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانوں کا انسانوں سے رویّہ ہی وہ چیز ہے جو کسی نظام کے مقام و مرتبہ کا تعیّن کرتا ہے۔

اِسی رویّہ کا ایک اہم پہلو وہ ہے جس کا تعلق پڑوس سے ہے۔ بہت اہم اس لیے کہ دُنیا میں ایسا انسان کہیں دستیاب نہیں کہ جس پر پڑوسی کی مہر نہ لگی ہو۔ فی الحقیقت پوری انسانی سوسائٹی پڑوسیوں پر مشتمل ہے۔ یہ ایک ایسی زنجیر ہے جس کی

ہر کڑی دوسری کڑی سے پیوست ہے۔ دُنیا کا ہر شخص ہمسایہ ہے اور ایسا ہونا اس کی فطرت کے عین مطابق ہے۔ کوئی ہمسایہ نہ ہو، محض ایک شاعرانہ آرزو ہے، جس شاعر نے یہ تمنا کی تھی اُس کی ہنگامہ پسندی کا یہ عالم تھا کہ نغمۂ شادی کے میسّر نہ ہونے پر وہ نوحۂ غم کی آرزو کیا کرتا۔

انسانی سوسائٹی بوقلمون سوسائٹی ہے۔ یہاں قدم قدم پر اور پہلو بہ پہلو دُکھ اور سُکھ، بیماری اور صحت، افلاس اور امارت، بہار اور خزاں اور اسی طرح کے دیگر تضادات موجود ہیں۔ انسانی ہمدردی کا تقاضا ہے کہ ان تضادات کو کم کیا جائے۔ اس سلسلہ میں پڑوس ایسا وسیع اور ہمہ گیر اور مؤثر کردار ادا کرسکتا ہے۔ اسلام کے پیش نظر چونکہ ایک اعلیٰ اور پاکیزہ انسانی معاشرہ کی تشکیل ہے اس لیے اس نے اس کی اہمیت کو پوری طرح محسوس کیا ہے اور اسے وہ مقام دیا ہے جس سے اور معاشروں کا تخیل بھی ناآشنا ہے۔ پڑوسیوں کا مرتبہ تو اور آگے ہے۔ ایک صحیح حدیث کے مطابق اسلامی معاشرہ میں عام مسلمانوں کی باہمی رحمت، محبت اور تعلقِ خاطر کی کیفیت بھی جسم کے مانند ہوتی ہے، جس کا ایک عضو اگر بیمار پڑتا ہے تو پورے کا پورا جسم بے خوابی اور بخار میں مبتلا ہو کر بے قرار ہو جاتا ہے[1] یا اہل ایمان کے باہمی تعلق کی مثال عمارت کی سی ہے جس کی ہر اینٹ دوسری اینٹ کے لیے قوت کا باعث ہوتی ہے۔ یہ مثال بھی صحیح حدیث میں بیان ہوئی ہے[2] اور اسلام کے تصورِ ہمسائیگی پر پوری طرح منطبق ہوتی ہے۔ اسلامی معاشرے میں گھروں یا بہ الفاظ دیگر پڑوسیوں کا مقام عمارت میں لگی ہوئی اینٹوں کا سا ہے جن کی باہم پیوستگی اور ایک دوسرے کا بوجھ اُٹھانے میں عمارت کی قوت اور بقا کا راز مضمر ہے۔ اسلام میں پڑوس کا یہی کردار ہے۔ پڑوسی الگ الگ گھروں میں رہتے ہیں۔ ان گھروں کے مابین دیواریں بھی ہوتی ہیں، لیکن انہیں محض اس لیے کھڑا

---

[1] بخاری، الصحیح، بابی الحلبی، مصر، ۱۳۵۲ھ جلد ۴ ص ۳۶

[2] ایضاً ص ۳۷

کیا جاتا ہے کہ کوئی اس کے آرام میں مخل نہ ہو۔ یہ دیواریں پڑوسیوں کے باہمی خلوص و محبت کے جذبات میں حائل نہیں ہوتیں، بلکہ ان کو اور مضبوط کرتی ہیں۔ اور یہ "خمیہ ہائے ما جدا دلہا یکیست" کی تصویر پیش کرتی ہیں۔ اس تمہید کے بعد اب اسلامی نظام معاشرت کے رخ ہمسائیگی کا ایک مختصر سا خاکہ ملاحظہ ہو۔ قرآن میں ارشاد ہوتا ہے:

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا۔[1]

"اور تم اللہ ہی کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھیراؤ، اور والدین، قرابت داروں، یتیموں، مسکینوں، رشتہ دار ہمسایوں، غیر رشتہ دار ہمسایہ، ہم نشین، مسافر اور اپنے لونڈی غلاموں کے ساتھ احسان کا برتاؤ کرو، اللہ تعالیٰ اترانے والوں، بڑائی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔"

یہ آیت اسلامی معاشرے کی ایک ہمہ گیر اساس مہیا کرتی ہے۔ اس میں تین چیزیں خاص طور پر قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کو یہ انسان — جن میں پڑوسی بھی شامل ہیں — اس قدر عزیز ہیں کہ ان کے ساتھ احسان کا حکم اپنی عبادت کے امر اور شرک سے نہی کے بالکل متصلاً دیا ہے۔ دوسرا یہ کہ حکم عدل کا نہیں احسان کا ہے۔ اور جیسا کہ امام راغب اصفہانی کہتے ہیں — "الاحسان فوق العدل"[2] یعنی احسان عدل سے برتر چیز ہے۔ عدل یہ ہے کہ انسان دوسروں کو ان کا حق دے دے اور اپنا حق اُن سے وصول کر لے، لیکن احسان کسی کو اس کے حق سے زیادہ دینے اور اپنے حق سے کم لینے پر رضامند ہونے کا نام ہے۔ انسان کا ایک مسئلہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے

---

[1] القرآن ۴/۳۶

[2] امام راغب اصفہانی المفردات فی غریب القرآن، بابی الحلبی مصر ۱۳۸۱، ص ۱۱۹۔

کہ وہ اپنے حق پر قناعت نہیں کرتا، دوسروں کے منہ سے نوالہ چھیننے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر سوسائٹی میں عدل کی فضا موجود ہو تو اِس پریشان کُن مسئلہ کے سر اُٹھانے کے مواقع بہت کم رہ جاتے ہیں، لیکن یہاں یہ نہیں کہا جا رہا۔ "عدل کرو اور زیادتی نہ کرو" بلکہ ایثار اور قربانی کی تعلیم دی جا رہی ہے کہ "دو تو زیادہ دو اور لو تو کم لو"۔ عدل میں بعض اوقات جبر کا ایک پہلو موجود ہوتا ہے۔ انسان نہیں چاہتا، مگر اُسے عدل کے تقاضے پورے کرنے پڑتے ہیں، لیکن احسان ہمیشہ خوش دلی سے ہوتا ہے۔ اِسی بنا پر اس سے وہ معاشرہ وجود میں آتا ہے جس کے افراد خلوص و ایثار کے پیکر ہوتے ہیں خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ اور دوسروں کی جان بچانے کے لیے اپنی جان قربان کر دیتے ہیں۔ جس طرح دیکھنے والوں کو پیپل کے ننھّے سے بیج میں پیپل کا پورا قدآور درخت نظر آ جاتا ہے۔ اِسی طرح احسان کے اس ایک لفظ میں اسلامی معاشرے کا سارا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔

آیت مذکورہ میں خاص طور پر قابل غور تیسری چیز وہ سزا ہے جو احسان سے رُوگردانی کرنے والوں کے لیے تجویز کی گئی ہے۔ قرآن نے انہیں مختالاً فخوراً یعنی بالفاظ شاہ ولی اللہ دہلوی "متکبر خود ستائندہ" اور بہ ترجمہ مولانا محمود الحسنؒ "اترانے والا بڑائی کرنے والا"، کہہ کر اللہ کی ناپسندیدگی کی سزا سنائی ہے، جس سے سنگین تر سزا کا تصور بھی ممکن نہیں۔ ایک انسان کی اس سے زیادہ کیا بدبختی ہو سکتی ہے کہ وہ اس ذاتِ رحمٰن و رحیم کی نگاہ میں ناپسندیدہ اور مبغوض قرار پائے جس کی رحمت ہر چیز کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ قرآن کی یہ آیت محکمات میں سے ہے اور ہمسایوں کے حقوق کے بارے میں نصِ قطعی، لیکن اس میں ان معنوں کی تفصیل بیان نہیں کی گئی۔ بس ایک لفظ احسان کہہ کر وہ سب کچھ بیان کر دیا گیا ہے جو حسنِ سلوک کے ذیل میں آتا ہے۔ ان کی توضیح و تبیین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ہے لیکن اسے پیش کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ عربی لغت کی رُو سے لفظ جار (پڑوسی) کی کچھ تشریح کر دی جائے:

الجار من یقرب مسکنه منك ...... و استعظم حق عقلاً و شرعاً عبر عن کل من یعظم حقه او یستعظم حق غیره بالجار ...... ویقال استجرته فاجارنی۔[1]

"جار وہ ہے جس کا مسکن تمہارے قریب ہو ..... چونکہ جار (پڑوسی) کا حق عقلاً و شرعاً بڑا سمجھا گیا ہے۔ اس وجہ سے ہر وہ شخص جس کا حق بڑا ہے، اُسے جار کہا جاتا ہے .... اور کہتے ہیں استجرتہ میں نے اس سے پناہ مانگی فاجارنی تو اُس نے مجھے پناہ دی۔

الجار المجار فی المسکن، الشریك فی العقار، المجیر و المستجیر - الجوار ایضاً العهد و الامان - والجوار ان تعطی الرجل ذمة فیکون بها جارك - تقول العرب هو فی جواری ای فی عهدی و امانی۔[2]

الجار کے معنی ہیں سکونت میں قریب، جائیداد میں حصہ دار، پناہ دینے والا، پناہ مانگنے والا۔ جوار: پڑوس کے علاوہ اس کے معنی عہد اور امان کے ہیں۔ جوار یہ ہے کہ کسی شخص کو تم حفاظت دو۔ وہ تمہارے جوار (حفاظت میں ہوگا) عرب کہتے ہیں، وہ میرے جوار یعنی میری حفاظت اور امان میں ہے۔

جار اور جوار کا یہ مفہوم ان کے اُردو اور فارسی مترادفات ـــ پڑوسی، پڑوس، ہمسایہ، ہمسائیگی ـــ سے کہیں زیادہ وسیع اور گہرا ہے۔ قرآن و حدیث کا مطالعہ کرتے وقت اُن کی یہ معنویت ضرور ذہن میں رہنی چاہیے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اس کی خاص اہمیت ہے۔ اس کے بغیر حسنِ جوار (اچھی ہمسائیگی) کی اس وسعت اور گہرائی تک نظر نہیں پہنچے گی جو اسلام کو مطلوب ہے۔ اس کی رُو سے خود جوار (آس پاس

---

[1] امام راغب اصفہانی المفردات فی غریب القرآن بابی الحلبی مصر ۱۳۸۱ھ ص ۱۱۹۔
[2] سعید الخذری الشرتونی اقرب الموارد، قم ایران ۱۴۰۳ھ جلد ۱ ص ۱۴۹

رہنے میں) کا یہ تقاضا موجود ہے کہ پڑوسی مشکل وقت میں ایک دوسرے کے کام آئیں۔ اور جب اچانک انہیں کسی سہارے یا پناہ کی ضرورت ہو تو اُس کی تلاش میں کہیں دور نہ جانا پڑے۔ گھر کے سامنے یا پس دیوار اُسے موجود پائیں۔

اب قرآن مجید کے حکمِ احسان کی تبیین و تفسیر رسولِ کریم کے ارشادات میں ملاحظہ ہو۔ حضورؐ نے فرمایا:

۱۔ خدا کی قسم وہ شخص صاحبِ ایمان نہیں، خدا کی قسم وہ شخص صاحبِ ایمان نہیں، خدا کی قسم وہ شخص صاحبِ ایمان نہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا "یا رسول اللہؐ کون؟" فرمایا: "جس کے پڑوسی اس کی ایذا رسانیوں سے محفوظ نہ ہوں[1]۔"

۲۔ جو شخص اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے اُسے پڑوسیوں کی عزت کرنی چاہیے[2]۔

۳۔ تم میں سے کوئی شخص صاحبِ ایمان نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے پڑوسی یا فرمایا بھائی کے لیے بھی وہی چیز پسند نہ کرے جسے وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے[3]۔

حضورؐ کے ان فرمودات سے واضح ہے کہ آپؐ کی نگاہ میں ایمان اور حسنِ جوار (اچھی ہمسائیگی) کا آپس میں کتنا گہرا رشتہ ہے کہ اگر دوسرا نہ ہو تو پہلے کی نفی ہو جائے گی۔ ایک مومن کے لیے ایمان سے زیادہ قیمتی چیز کوئی نہیں۔ وہ اس کی خاطر جان قربان کر دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر بُرا فعل کیا ہو سکتا ہے کہ جس کا ارتکاب کر کے وہ اپنی سب سے زیادہ قیمتی چیز گنوا بیٹھے!

اُوپر احادیث میں حسنِ جوار کے مختلف درجات بیان ہوئے ہیں۔ اس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ اگر کوئی صاحبِ ایمان اپنے پڑوسی کو آرام نہیں پہنچا سکتا تو کم از کم وہ اُسے ایذا تو نہ دے۔ اس بات کو حضورؐ نے ایسے مؤثر پیرایہ میں بیان کیا ہے کہ

---

[1] بخاری، الصحیح ۴/۳۷

[2] ایضاً، مسلم، الصحیح کراچی۔ ت۔ ن ۱/۱۵۸/۵۰

[3] مسلم، الصحیح ۱/۵۰

اس کی نظیر بہت کم ملتی ہے۔ ایک حضورؐ کا ارشاد پھر تین مرتبہ اور ہر مرتبہ خدا کی قسم کے ساتھ۔ اس سے پڑوسیوں کو ایذا رسانی کے فعل کی شناخت کا اندازہ کر لینا چاہیے!
دوسری حدیث میں حسنِ جوار کے مثبت اور برتر درجہ کی نشان دہی کی گئی ہے اور وہ یہ کہ ایمان کا تقاضا صرف یہ نہیں کہ ہمسایہ کو ایذا نہ دی جائے، بلکہ یہ بھی لازم ہے کہ باہم عزت و احترام کا رویہ اپنایا جائے۔ تیسری حدیث ہمیں عزت و احترام کے مقام سے بھی آگے "من تو شدم تو من شدی" کے مقام پر لے جاتی ہے اور ہر صاحب ایمان سے مطالبہ کرتی ہے کہ اگر اُسے اپنا ایمان عزیز ہے تو وہ اپنے پڑوسی کے دکھ کو اپنا دکھ اور اس کے سُکھ کو اپنا سُکھ سمجھے اور غیریت کی ہر دیوار کو گرا دے۔
ایمان سے آگے محبت کا مقام ہے اِسی سے ایمان کے اندر حرارت پیدا ہوتی ہے۔ قربِ الٰہی کے اس بلند ترین مقام تک پہنچنے کے لیے بھی حضورؐ نے حسنِ جوار کو لازم قرار دیا ہے۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا تو صحابہ کرامؓ آپؐ کے وضو کے پانی کو (تبرکاً چہروں پر) ملنے لگ گئے۔ حضورؐ نے پوچھا "تمہیں کس چیز نے اس پر آمادہ کیا؟" انہوں نے عرض کیا "اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت نے" فرمایا: "جس کو یہ پسند ہو کہ وہ اللہ اور اُس کے رسولؐ سے محبت کرے یا اللہ اور اس کا رسولؐ اُس سے محبت کریں اُسے چاہیے کہ جب بولے سچ بولے، اُس کے پاس امانت رکھی جائے تو (عند الطلب) اُسے واپس کر دے۔ اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے"[1]۔
یہ حدیث محبتِ الٰہی کو حسنِ جوار سے منسلک کر کے اس کی اہمیت کا ایک نیا رُخ سامنے لاتی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ صحابہؓ کا حضورؐ کے آبِ وضو سے حصولِ تبرک کے فعل کا محرک خدا اور رسولؐ کی محبت تھی۔ اسی لیے حضورؐ نے انہیں اس سے روکا نہیں بلکہ محبت کی ایک بلند تر سطح سے آشنا کیا اور واضح کیا کہ اس محبت کا راز خدا کے بندوں کی محبت اور ان کے حقوق کی ادائیگی میں مضمر ہے جس کا ایک اہم مظہر پڑوسیوں سے فیاضانہ برتاؤ ہے۔

(باقی)

---

[1] محمد بن عبداللہ الخطیب، مشکوٰۃ المصابیح مجتبائی دہلی۔ جلد ص ۴۲۴ بحوالہ بیہقی شعب الایمان۔